یوسف نون☆

# دکنیات کا ایک معتبر حوالہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

**An authentic researcher of Dakani: Jameel Jalibi**
By *Yousuf Noon, PhD Scholar, Department of Urdu, Bahauddin Zakaria University, Multan*

Dr Jamil Jalibi, who recently passed away, was one of the most respected researchers of Urdu. His research work on Dakani literature was truly pioneering in certain respects. The author in this article has succinctly discussed almost the entire research works by Jalibi with special emphasis on Dakani and its literature. The author has also compared the previous research works carried out by other towering personalities and has concluded that the works on Dakani by Jalibi are far more comprehensive, profound and detailed.

اردو نظم و نثر کی ابتدا اور اولیت کا سہرا دکن کے سر ہے۔ جنوبی ہند، جسے دکن سے موسوم کیا جاتا ہے، کے خطے میں پرورش پانے اور پروان چڑھنے والے علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا مطالعہ دکنیات کے زمرے میں آتا ہے۔[۱] اردو ادب کی دنیا میں دکن کے علوم و فنون کو متعارف کرانے کا سہرا محققین اور مدونین کے سر جاتا ہے۔ اردو ادب کے سرمائے سے سرزمین دکن اس قدر زرخیز اور ثروت مند ہے کہ اس کے ذکر اور شمولیت کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو پاتی۔ دکنی مخطوطات کی دریافت اور تدوین کے بغیر اردو زبان کی ساخت، ابتدا اور لسانی تغیر و ارتقا کو سمجھنا، ادب کی معتبر اور جدید طرز کی تاریخ مرتب کرنا ناممکنات میں سے تھا۔

بیسویں صدی کی ابتدا سے ربع سوم تک کا عرصہ دکنی مخطوطات کی دریافت اور ان متون کی تدوین کے لیے خاصا بابرکت رہا ہے۔ دکن اور دکن سے باہر کئی مخطوطات قلمی نسخے اور بیاضیں دریافت ہوئیں، ان کی ترتیب و تدوین اور انتخاب کا کام، جو یقیناً محنت طلب تھا، کسی طور پر ہوتا رہا۔ اس سارے کام کو جدید طریق تحقیق و تدوین پر پرکھا جائے تو

☆ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان

شاید چند مستثنیات سے قطع نظر یہ کام خامیوں سے پُر اور غیر تشفی بخش لگے، مگر اس کام سے مآخذات کا محفوظ ہو جانا کسی نعمت سے کم نہیں اور مزید زبان و ادب اور تاریخ کے مختلف گوشوں کے لیے تلاش و تحقیق کی راہیں بھی خاصی آسان ہوئی ہیں۔ دکنیات کے ماہرین کی خاصی معتبر تعداد دکن اور اس سے باہر موجود رہی ہے۔

تحقیق کی دنیا میں مولوی عبدالحق تمام تر اختلافات کے باوجود بڑا نام ہیں۔ انھوں نے دکنی متون میں ملا وجہی کی سب رس، قطب مشتری اور نصرتی کی مثنوی گلشن عشق کی تدوین کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا دکنیات میں ایک بڑا نام ہے۔ انھوں نے کئی دکنی شعرا کے کلام کے انتخاب کے ساتھ ساتھ کلیات سلطان قلی قطب شاہ اور سید محمد والہ موسوی کی مثنوی طالب وموہنی مرتب کی ہے۔ سیدہ جعفر نے کلیات سلطان قلی قطب شاہ، شاہ تراب کی تصنیف من سمجھاون اور شاہ ابو الحسن کی تصنیف سکھ انجن کی تدوین کی ہے۔ ملا نصرتی کی رزمیہ مثنوی ''علی نامہ'' کو پروفیسر عبدالمجید نے، ملک الشعرا غواصی کے کلام کو کلیات غواصی کے نام سے محمد بن عمر نے اور بیجاپور کے آٹھویں عادل شاہی فرماں روا سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی کے کلام کو کلیات شاہی کے نام سے مبارز الدین رفعت نے ترتیب دیا ہے۔ غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ میر سعادت علی رضوی نے مرتب کی ہے۔ ہاشمی بیجاپوری کا دیوان ہاشمی، ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن، سراج اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب سراج سخن اور انھی کے کلام کا کلیات کلیات سراج اور صنعتی کی مثنوی قصہ بے نظیر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر نورالسعید اختر نے وجہی کی نثری تصنیف تاج الحقائق اور طبعی گولکنڈوی کی مثنوی بہرام و گل اندام اور خواجہ حمیدالدین شاہد نے لچھمی نرائن شفیق کی مثنوی تصویر جاناں کی تدوین کا کام کیا ہے۔ غواصی کی ایک اور مثنوی مینا ستونتی کی تدوین کا فریضہ پروفیسر غلام عمر خاں نے سرانجام دیا ہے۔

اسی طرح دیوان مہ لقابائی چندا جسے اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہونے کا شرف حاصل ہے سید شفقت حسین رضوی نے مرتب کیا ہے۔ افسر صدیقی امروہوی نے فقیر دکنی کی سنگھاسن بتیسی (منظوم) کو ترتیب دیا ہے۔ شیخ چاند ابن حسین نے ابن نشاطی کی پھول بن اور خان رستمی بیجاپوری کی مثنوی خاور نامہ کو، محمد سخاوت مرزا نے شاہ قاسم اورنگ آبادی کے دیوانِ قاسم کو اور محمد اکبرالدین صدیقی نے مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری کی مثنوی چندر بدن و مہیار کو نیز سید محمد بے نظیر وارثی گردیزی حسامی کے کلام، بے نظیر کو، مرزا جمال اللہ عشق اورنگ آبادی کے دیوان عشق کو اور سید برہان الدین جانم کے نثری رسالے کلمۃ الحقائق کو مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف معراج العاشقین مرتبہ مولوی عبدالحق کو تحقیق

اور مقدمے کے ساتھ از سر نو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے ولی دکنی کی کلیات ولی اور ڈاکٹر مسعود حسین خان نے عیسوی خان بہادر کا قصہ مہر افروز دلبر مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب نورس کی تدوین کی ہے۔ یہ وہ چند دکنی متون ہیں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

— ۲ —

دکنی تحقیق کا ایک اور معتبر حوالہ اردو کے مایہ ناز محقق، نقاد، ادبی مؤرّخ، کلچر شناس، لغت نگار، مترجم، مدیر اور ادیب ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔ تحقیق و تدوین کا عمل فن بھی ہے اور سائنس بھی۔ اس کی ایک اپنی الگ سے اہمیت ہے۔ متون علم کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر متون صحیح صورت میں موجود نہ ہوں تو تحقیق، تنقید اور تاریخ بے بنیاد اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو تاریخ ادبِ اردو کا مواد جمع کرتے وقت اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ سب سے پہلے متون کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ دکنی ادب کی روایت ولی دکنی سے کافی پیچھے بکھری پڑی ہے۔ جب تک اس خزانے کو دریافت کر کے محفوظ نہیں بنالیا جاتا، اس وقت تک تاریخ ادبِ اردو مرتب کرنے کا حق ادا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی صحیح نتائج برآمد اور پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تحقیق کے آغاز اور مقصد کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو دیے گئے ایک مصاحبے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> جب میں نے تاریخ پر کام شروع کیا تو محسوس کیا کہ قدم قدم پر رکاوٹیں موجود ہیں۔ نہ مستند متون مطبوعہ شکل میں ملتے ہیں اور نہ ادوار، شخصیات اور موضوعات پر بلند پایہ کام ہوا ہے۔ ادب کی تاریخ اس وقت لکھی جا سکتی ہے جب یہ سب چیزیں موجود ہوں اور ادبی مؤرّخ ان کی مدد سے اپنا کام انجام دے۔ اردو میں یہ سب مواد موجود نہیں تھا اس لیے ادبی تاریخ لکھتے وقت مجھے قدم قدم پر تحقیق کی ضرورت پڑی تا کہ سچ کو جھوٹ سے، غلط کو صحیح سے، حقیقت کو مغالطوں سے الگ کیا جا سکے۔ دراصل میری تحقیق کا کام تاریخ ادب اردو کے ساتھ شروع ہوا۔ یہ سال ۱۹۶۴ء کا سال تھا۔[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ ان کا کام دکنیات سے شروع ہوتا ہے اور تاریخ ادب کے ساتھ ساتھ ادب کی کئی اصناف پر محیط ہے۔ وہ تنقید کے لیے تحقیق اور تحقیق کے لیے تنقید کو لازم سمجھتے ہیں۔ رشید حسن خان اور گیان چند کا عقیدہ اس سے بالکل برعکس ہے اور وہ تحقیق میں تنقید کو تحقیق کی موت کے مترادف گردانتے ہیں۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

پہلے ہم نے تنقید شروع کی، تحقیق اس کے بعد آئی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ تحقیق کے آنے سے ہماری تنقید سنبھل گئی اور اس کے بعد میں نے ساری عمر یہ کوشش کی کہ تحقیق و تنقید کا ایسا امتزاج ہو جائے کہ ایک نئی شکل بن جائے۔ میرے ہاں تحقیق اور تنقید کا امتزاج ہے۔ جو بات کہی جائے وہ تحقیق کر لی جائے۔ صحیح اور غلط میں امتزاج پیدا کر لیا جائے اور پھر اسے استعمال کیا جائے۔(۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جو متون مرتب کیے ہیں ان کا اردو ادب میں اہم مقام ہے۔ یہ ایسے متون ہیں جن کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ نامکمل ہے۔ دیوانِ حسن شوقی، دیوانِ نصرتی اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی تدوین و اشاعت سے نہ صرف دکنیات کے ذخیرے میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اردو دکنی زبان، محاورات، ضرب الامثال املا اور صرف و نحو کے بارے میں بھی معلومات کا ایک خزانہ میسر آیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کام لسانیات میں گراں قدر اضافہ ہے۔(۴) ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مصاحبے میں اپنی تحقیقی کاوشوں پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

متون میں مَیں نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ قدیم اردو کی لغت میں نے مرتب کی ہے۔ جس میں تقریباً سوا گیارہ ہزار الفاظ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ میری ساری توجہ تاریخ ادب اردو پر رہی ہے۔ جس میں قدم قدم پر تحقیق کے عمل سے تاریخ کے کام کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ تاریخ ادبِ اردو اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں پہلی بار تحقیق و تنقید کا سماجی و تہذیبی حوالوں کے ساتھ، امتزاج ہوا ہے۔ یہ امتزاج اردو میں اس طرح پر پہلی بار ہوا ہے۔(۵)

ڈاکٹر وحید قریشی جمیل جالبی کے طریق تحقیق کو حافظ محمود شیرانی سے متاثر قرار دیتے ہیں۔ دونوں کے ہاں لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ دکن کی تاریخ بھی پیش نظر ہے۔ دونوں لسانی اور تاریخی پہلوؤں کی روشنی میں نتائج ترتیب دیتے ہیں۔(۶) وہ یہ اثرات دلائل کی پیش کش اور ترتیب میں بھی پاتے ہیں۔ جالبی کے ہاں حافظ محمود شیرانی کی مانند قیاسی اور غیر معتبر و غیر یقینی دلائل کو پہلے اور حتمی دلائل کو آخر میں جگہ دی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا اسلوب قاری کو مائل بھی کرتا ہے اور قائل بھی۔ ویسے تو وہ کسی ادبی فرقے سے تعلق نہیں رکھتے اور نہ ہی تحقیق و تنقید کو گروہوں میں بانٹنے کے قائل ہیں مگر تحقیق کی دنیا میں جب انھوں نے قدم رکھا تو بہت سا کام ہو چکا تھا۔ ان کے سامنے ایک طرف دبستانِ دکن اور دوسری جانب دبستانِ لاہور کا کام نمونے کے طور پر موجود تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان دبستانوں سے خوب اثر لیا ہے:

میں نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، دیوانِ شوقی، دیوانِ نصرتی قدیم اردو لغت وغیرہ کی کراچی میں بیٹھ کر تدوین کی ہے تو میں نے ایک طرف دکنی دبستان کی ساری روایت سے استفادہ کیا ہے تو دوسری طرف دبستان لاہور کی روایت لاہور سے استفادہ کر کے، ان دونوں کا امتزاج کیا ہے۔ اس طرح میرا تعلق ایک طرف دبستان دکن کی روایت سے ہے اور ساتھ ہی لاہور کے دبستان سے ہے۔(۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی تدوینِ متن کی روایت سے بھی جڑے ہوئے ہیں اور اپنے کام کو مفید بنانے کے لیے جدت بھی لاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو صرف ادبی مآخذات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ غیر ادبی مآخذات پر بھی توجہ دے کر حقیقت کی تہہ تک جا پہنچتے ہیں۔ اپنے وسیع مطالعے کی بنا پر منتشر اور متفرق معلومات کو یکجا کر کے اس سے نتائج برآمد کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کے عقیدے میں یہ شامل ہے کہ ہر چھوٹے بڑے بنیادی، ثانوی، ہر طرح کے ماخذ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا جائے اور اپنے ہاتھوں سے پرکھا جائے۔ وہ اس وقت تک قلم نہیں اٹھاتے جب تک اس موضوع سے متعلق گہرا مطالعہ حاصل نہیں کر لیتے۔ ان کے کام سے عیاں ہے کہ ان کی اپنے موضوع پر پوری گرفت ہوتی ہے۔

—۳—

''تاریخِ ادبِ اردو'' مرتب کرتے وقت ڈاکٹر جمیل جالبی نے کئی مخطوطات اور بیاضیں کھنگال ڈالی ہیں۔ اس عرق ریزی کے دوران میں انھیں انجمن ترقیٔ اردو کراچی کی مخزونہ بیاضوں سے ایک ایک کر کے حسن شوقی کی غزلیں ملیں جنھیں اکٹھا کر کے تدوین و ترتیب کے عمل سے گزار کر ڈاکٹر جمیل جالبی نے ادب کے قارئین اور محققین کو لسانی و ادبی سرمائے سے روشناس کرایا ہے۔ دسویں صدی ہجری کے اس اہم اردو شاعر کا سراغ سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں مولوی عبدالحق نے لگایا اور اسے اپنے ایک مضمون میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد سخاوت مرزا نے انجمن ترقیٔ اردو کے رسالہ اردو میں حسن شوقی کی تین غزلیں دریافت کر کے شائع کرائیں اور ۱۹۶۵ء میں بھی حسینی شاہد نے پانچ غزلیں شائع کرائیں۔ حسن شوقی کا دیوان سب سے پہلے جمیل جالبی ہی نے مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ حسن شوقی کا یہ دیوان مثنویوں فتح نامہ شاہ نظام، میزبانی نامہ اور ۱۳۱ غزلیات پر مشتمل ہے۔ چند غزلوں کے علاوہ باقی تمام کلام غیر مطبوعہ اور نو دریافت شدہ ہے۔ دو بیاضی نسخوں کی مدد سے فتح نامہ نظام شاہ اور میزبانی نامہ مرتب کیا گیا ہے۔ فتح نامہ کی بنیاد نسخۂ اول پر رکھی گئی ہے۔ انھوں نے دو نسخوں کا جو بیاض کی صورت ہیں، مکمل تعارف کرایا ہے۔ نسخۂ اول کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بیاض نمبر ا رمخزونہ انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، کراچی، جس میں فتح نامہ نظام شاہ (نسخۂ اوّل) اور میز بانی نامہ ۲ /۱ر ۲۹ × /۱ر ۵ کی تقطیع پر لکھی گئی ہے۔ متن میں ۱۷ سطریں اور حاشیے پر ۴، ۳ سطریں ہیں۔ عنوانات فارسی میں اور سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ خط نستعلیق خوشنما ہے۔ اس میں کل صفحات ۱۰۷ ہیں۔[(۸)]

نسخۂ اول کو بنیاد بنانے کے بعد، نسخۂ اول، اور دوم، دونوں کا اختلاف حاشیے میں دے دیا گیا ہے۔ وہ اشعار جو نسخۂ ثانی میں تو ہیں مگر اول میں نہیں، ان اشعار کو نسخۂ اول میں موضوع کے اعتبار سے کھپا دیا گیا ہے۔ ایسے اشعار جو دونوں نسخوں میں ترتیب و الفاظ کے اعتبار سے ایک سے تھے، ان میں کسی طور کا اختلاف نہ تھا، ان کے سامنے (ص) کی علامت درج ہے۔ بیاضوں کے ترقیموں کو نکال کر تعارف میں شامل کر دیا گیا ہے۔ میزبانی نامہ کا ایک ہی نسخہ تھا، اس میں اختلافِ نسخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے صرف انھی بیاضوں کا تعارف پیش کیا ہے، جن میں فتح نامہ اور میزبانی نامہ تھے۔ جن بیاضوں سے اِکا دُکا غزلیں اکٹھی ہوئیں۔ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سخاوت مرزا اور حسینی شاہد کی دریافت شدہ غزلیں بھی شامل ہیں اور ان سے اختلافات حاشیے میں دیے گئے ہیں۔ ہر پانچ اشعار کے بعد نمبر شمار درج کیے گئے ہیں۔ دونوں مثنویوں کے بعد ردیف وار غزلیات اور آخر میں متفرقات کے عنوان سے ایک نظم درج ہے۔ جس میں ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سب سے آخر میں پندرہ صفحات پر مشتمل دوہرے جدول کی صورت میں، تفہیم کو آسان بنانے کے لیے فرہنگ دی گئی ہے۔ متن کی تو اپنی ہی اہمیت ہے۔ تدوین کا اصل کام متن کو محفوظ بنانا اور ادب کے قارئین تک پہنچانا ہے مگر ڈاکٹر جمیل جالبی کے لکھے مقدمات کسی تحقیقی و تنقیدی کارنامے سے کم نہیں اور اپنی اہمیت کے آپ حامل ہیں۔ افسر صدیقی لکھتے ہیں:

> جالبی صاحب قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے حتی الامکان اس فرض کے ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور کسی قسم کا قدیم ذریعۂ معلومات نہ ہونے کے باوجود اکثر و بیشتر الفاظ کی ردیف اور فرہنگ مرتب کر دی۔ جہاں تک دیوانِ شوقی کے متن کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ خوب ہے۔ لیکن جالبی صاحب کا اصل کارنامہ وہ بسیط و مشرح اور فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں شوقی کے زمانے کی لسانی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اور دوسری ملکی زبانوں کے ساتھ اس کے تعلق پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی کے مقدمے سے ان گتھیوں کو سلجھانے میں قرار واقعی اور قابلِ قدر مدد مل سکتی ہے جو اردو کو مغربی پاکستان کی قومی زبان تسلیم کرنے میں آڑے آسکتی ہیں۔[(۹)]

ڈاکٹر جمیل جالبی مقدمے کے پہلے حصے میں حسن شوقی اور اس دور کے سیاسی و سماجی حالات اور تاریخ سے متعارف کراتے ہیں۔ مقدمے کے دوسرے حصے میں حسن شوقی کے کلام کا لسانی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور تیسرا حصہ وہ ہے جس میں بیاضوں کا تعارف اور طریقۂ تدوین درج ہے۔ جمیل جالبی محمود شیرانی کی طرح اندرونی شواہد سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس طرح شیرانی نے فردوسی شناسی میں مصنف سے متعلق تمام تر بنیادی معلومات، ان کی تصنیف شاہ نامہ سے اخذ کی ہیں اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی مثنویوں اور غزلوں ایسے داخلی مآخذات سے مصنف کے بارے میں شواہد نکالتے ہیں۔ وہ حسن شوقی کے نام کی سند کے طور پر شوقی کا مطلع، ابن نشاطی کی، پھول بن اور سید اعظم بیجاپوری کی فتح جنگ میں سے ایک ایک شعر پیش کرتے ہیں جن میں شوقی حسن کے نام سے ذکر ملتا ہے۔ فتح نامہ نظام شاہ کے آخر اور میزبانی نامہ کے ترقیمے میں حسن شوقی جب کہ ایک مخطوطے کے حوالے سے ان کا نام ''شیخ حسن شوقی'' بتاتے ہیں۔ اس ساری بحث کا نتیجہ نکالتے ہوئے شیخ حسن نام اور شوقی تخلص ٹھہراتے ہیں۔ پھول بن اور فتح جنگ میں شوقی کا تذکرہ ہونے کے سبب انھیں اپنے زمانے کا مسلم الثبوت استاد شاعر قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی بالواسطہ اور غیر ادبی حوالوں کو نظر انداز کرنے کی بجائے، ان سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> تحقیقی نتائج حاصل کرنے کے لیے بندھے ٹکے مآخذ اور منابع سے ہی رجوع کرنا کافی نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لیے کبھی غیر ادبی اور بالواسطہ مآخذ اصلی اور بنیادی بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں یہ طریقۂ کار عام ہے۔ وہ کسی شخص کی سوانح مرتب کرنے کے لیے، سوانحی ماخذ کے علاوہ اس دور کی تواریخ، سفرناموں، یادداشتوں اور معاصر دواوین حتیٰ کہ ذاتی بیاضوں سے بھی مدد لیتے ہیں جن میں ایسے نمونے بھی تھے جو تاریخ ادب اردو میں جا بجا آتے ہیں۔[۱۰]

اس کے علاوہ انھوں نے دونوں مثنویات کا تعارف کرایا ہے۔ فتح نامہ شاہ نظام جو جنگ تالیکوٹ (۱۵۶۴ء) کی فتح پر لکھی گئی ہے۔ اس میں وہ حسین نظام شاہ کو فاتح تالیکوٹ قرار دیتے اور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ دوسری مثنوی میزبانی نامہ ہے۔ جس میں محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ۔۱۰۶۸ھ) اور ان کی شادی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

اس مقدمے کے دو حصے خاصے اہم ہیں۔ ایک وہ حصہ جہاں مولوی عبدالحق سے اختلاف کیا گیا ہے دوسرا وہ حصہ جہاں حسن شوقی کی شاعری کا لسانی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، مولوی عبدالحق نے فتح نامہ کے کچھ اشعار الحاقی قرار دیے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نہ صرف ان سے اختلاف کرتے ہیں، بلکہ ان کے اعتراضات کے رد میں بھرپور دلائل بھی پیش

کرتے ہیں۔ میزبانی نامہ جس میں محمد شاہ عادل کی شادی کا احوال ہے۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک یہ رشتہ مصطفیٰ خان وزیر اعظم کی بیٹی سے ہوا، جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی یہ ثابت کر پانے میں حق بجانب ہیں کہ یہ رشتہ نواب مظفر علی خان کی لڑکی سے وقوع پایا تھا۔ انھوں نے میزبانی نامہ کی ضمنی سرخی ''در بیان مہمانی کردن سلطان محمد عادل شاہ روادادن جہیز دختر نواب مظفر خان'' سامنے رکھ دی ہے۔ جس کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق کے لیے تنقید اور تنقید کے لیے تحقیق کو کارگر، مددگار اور لازم سمجھتے ہیں۔ ان کی تحقیقی کاوش اور مہارت کے ساتھ ساتھ ان کا تنقیدی شعور ہر جگہ واضح اور نمایاں ہے۔ قدیم ادب سے متعلق ان کے محاکے باوزن ہیں، جو دل چسپی سے بھی ہرگز خالی نہیں۔ فتح نامہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> پوری مثنوی میں ایک روانی، ایک تیز بہاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اسی وقت محسوس کیا جاسکتا ہے جب پڑھتے وقت جدید تلفظ اور ساکن و متحرک کا خیال نہ رکھا جائے۔ اس روانی میں ایک ایسے آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے تاشے بجانے سے پیدا ہوتا ہے۔ حسن شوقی لفظوں کے استعمال پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور آہنگ کا احساس ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔(۱۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی حسن شوقی کی مثنویوں میں سے اس دور کی تہذیب و ثقافت کے خدوخال کے ساتھ ساتھ لسانی ساخت و ارتقا کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں جو خاصا اہمیت کا حامل ہے۔ دیوان حسن شوقی کے لسانی تجزیے سے جمیل جالبی نے دسویں صدی ہجری کی اردو زبان اور اس کے ارتقا کے عمل کو سمجھنا ادب و لسانیات کے محققین کے لیے آسان کر دیا ہے۔ انھوں نے اس دور میں اسما کو جمع بنانے، افعال و ضمائر اور دیگر مقامی زبانوں اور بولیوں سے اشتراک کا تفصیلاً جائزہ لیا ہے۔ اس دور میں اسماء کی جمع بنانے کے لیے اسم کے آخر میں ''یاں'' لگانے کا قاعدہ عام تھا۔ جیسے ہوا سے ہوایاں فوج سے فوجیاں، ناگ سے ناگنیاں وغیرہ۔ اسی طرح جدید زبان کے مقابلے میں افعال کے برتے جانے کا کافی فرق ہے۔ وہ لازم و متعدی افعال جو ماضی کے صیغوں میں ''نے'' کے استعمال سے پہچانے جاتے ہیں وہ ضمائر متکلم و حاضر میں حسن شوقی کے یہاں نہیں ملتے۔ اس میں تذکیر و تانیث کی رائج حالتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔(۱۲) افعال معاون اور حروف ربط کے لحاظ سے بھی اس دور کی اردو اور سندھی میں گہرے اور قریبی رشتے تلاش کیے ہیں، مثلاً:

| سندھی | قدیم اردو |
|---|---|
| ماں آہیاں | میں اہوں |
| اسیں آہیوں | ہم آہیں |

| | |
|---|---|
| توں آہیں | تو اہیں |
| ہوآہے | وہ اہے |
| ہوآہیں | وہ اہیں |

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم اردو اور سندھی میں یہ حروف ربط تقریباً ایک سے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سندھی میں آہے کھینچ کر اور دکنی میں آہے قدرے تخفیف سے بولا جاتا ہے۔(۱۳)

اس کے علاوہ قدیم اردو کی سرائیکی، پشتو، پنجابی، افغانی، گجراتی، مرہٹی، بروہی، راجستھانی، برج بھاشا، ہندی، فارسی، عربی اور ترکی وغیرہ سے مماثلتوں کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں۔ اس دور کی زبان کی ساخت اور ترکیبی منازل پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> حسن شوقی کی زبان اس زمانے کے دکن کے عام بول چال کی زبان ہے۔ اس میں ان تمام بولیوں اور زبانوں کے اثرات کی ایک کھچڑی سی پکی دکھائی دیتی ہے۔ جو آئندہ زمانے میں ایک جان ہوکر اردو کی معیاری شکلیں متعین کرتے ہیں۔ زبان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اپنے ارتقا کی ترکیبی منزل میں ہے جہاں سے اردو حروف علت کا موجودہ نظام پروان چڑھنے نکلا تھا اس کی سب سے واضح شکل صیغۂ ماضی کے افعال میں ملتی ہے۔ ماضی اور اسم مفعول بنانے کا موجودہ اصول یہ ہے کہ مادوں میں ''ا'' یا حرفِ علت ''آ'' بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے پڑھنا مصدر سے پڑھ (مادہ) اور اس سے پڑھا (ماضی مطلق) لیکن زبان کے ارتقا کے اس دور میں ماضی مطلق بنانے کے لیے ''یا'' لگایا جاتا تھا پڑھ سے پڑھیا، لکھ سے لکھیا۔(۱۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی قدیم دکنی متون کو ترتیب دیتے ہوئے املا نہیں بدلتے، قدیم املا ویسے ہی رہنے دیتے ہیں جو آج کے رائج معیاری املا سے خاصا مختلف ہے۔ چند ایک تبدیلیاں جو ناگزیر تھیں، انھیں ضرور عمل میں لایا گیا ہے۔ قدیم املا سے اس دور کے املا کا پتا چلتا ہے:

> زیادہ تر الفاظ میں نے اصل املا کے مطابق رہنے دیے ہیں۔ صرف ''ہ'' کو ''ھ'' میں بدلا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو، اور شعر آسانی سے وزن میں پڑھا جا سکے۔ بعض لفظوں کو میں نے صرف الگ کر دیا ہے تاکہ لفظ کو پہچاننے میں آسانی ہو۔ یا پھر میں نے ایسے

الفاظ کا املا درست کیا ہے جو اس وقت بھی صحیح نہیں مانے جاتے ہوں گے، جیسے غوص اعظم کو غوث اعظم کر دیا ہے۔ حجرت کو ہجرت اور نصل کو نسل۔[۱۵]

جن الفاظ کو ایسی تبدیلیوں سے گزارا گیا ان کو جدول میں دے دیا گیا ہے۔ آخر میں دی گئی فرہنگ میں بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ آج کے معنی کی بجائے اس وقت کے مروجہ معنی درج کیے جائیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی دیوانِ حسن شوقی کے خاص معترض ہیں۔ قدیم اردو کا سندھی زبان سے موازنہ انھیں خاص طور کھٹکتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ موازنہ یک طرفہ ہے جس میں پنجابی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے املا میں جس تغیر و تبدل سے کام لیا ہے، اس پر بھی ڈاکٹر وحید قریشی خاصے سیخ پا نظر آتے ہیں۔ فرہنگ میں دیے گئے قدیم الفاظ کے معنی، جو اس دور کے مروجہ معنی کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اُن سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔[۱۶] اس سب کے باوجود ڈاکٹر جمیل جالبی کے کام کی اہمیت ہے۔ ان کا کام تحقیق و تدوین کے جدید خطوط پر استوار ہے۔

— ۴ —

بیجاپور کے آخری دور کے بڑے شاعر، ملک الشعرا ملا نصرتی ہیں۔ جنھوں نے تین بادشاہوں، محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی شاہی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا ہے۔ ملا نصرتی کی دو مثنویاں علی نامہ اور گلشنِ عشق منظرِ عام پر ہونے کے سبب وہ صرف مثنوی کے شاعر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ یہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کا ہی ثمر ہے کہ انھوں نے دیوانِ نصرتی میں ۲۳/غزلیات، ۲۸/رباعیات، ۳/قطعات، ۳/قصائد، ۲/مخمس، ایک ہجو، ۵۵/ابیات اور ایک مثنوی تاریخ سکندری کو شامل کیا ہے۔ انھوں نے یہ کام بھی تاریخ ادبِ اردو پر کام کرتے ہوئے انجمن ترقیٔ اردو کی مخزونہ بیاضوں کی مدد سے پایہ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> تاریخ ادبِ اردو پر تن تنہا کام کرتے ہوئے جب سینکڑوں بیاضوں اور مخطوطات کے جنگل سے گزرا تو مجھے اکثر ملا نصرتی کا کلام بھی ملتا رہا، جسے میں دوسرے شعرا کے نایاب کلام کی طرح جمع کرتا رہا۔ تاریخ ادبِ اردو پر لکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ریزہ ریزہ کر کے میرے پاس نصرتی کا اتنا کلام جمع ہو گیا ہے کہ اب نصرتی پر لکھنا اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہے۔ نصرتی کا یہی وہ نادر و نایاب کلام ہے جسے ترتیب دے کر اب دیوانِ نصرتی کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔[۱۷]

دیوانِ نصرتی مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی سب سے پہلے سہ ماہی، صحیفہ لاہور (شمارہ ۶۱، اکتوبر ۱۹۷۲ء) میں

شائع ہوا ہے۔ بعد ازاں لاہور کے ایک اشاعتی ادارے قوسین سے (۱۹۷۲ء) کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔[۱۸] دیوانِ نصرتی کا مقدمہ دیوانِ حسن شوق اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مقابلے میں مختصر اور تنقیدی نوعیت کا حامل ہے۔ دیوانِ نصرتی کے مقدمے میں مرتب نے اپنا زیادہ زور مصنف کے حالات، سیاسی و سماجی ماحول اور نصرتی کے کلام کے فنی محاسن بیان کرنے میں صرف کیا ہے۔ اس مقدمے میں مخطوطوں اور بیاضوں کے تعارف پیش کیے گئے ہیں اور نہ ہی اختلافِ نسخ درج ہیں۔ اشعار کی نمبر شماری تک بھی نہیں کی گئی۔ البتہ غزلیات ردیف وار ترتیب دی گئی ہیں اور آخر میں حروفِ تہجی کی ترتیب سے ۱۳ر صفحات کی فرہنگ دی گئی ہے۔

ملّا نصرتی کے حالات زندگی دریافت کرنے کے لیے نصرتی کے اپنے اور دیگر شعرا کے کلام کے ساتھ ساتھ کئی تذکروں کو بھی ماخذ بنایا گیا ہے۔ تمام مآخذات کو بروئے کار لا کر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کا پورا نام محمد نصرت ہے اور حاسدین کے قتل کرنے کے سبب ان کی موت واقع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نصرتی کی غزل پر یوں اپنا محاکمہ پیش کرتے ہیں:

> جہاں تک نصرتی کی غزل کا تعلق ہے دکنی غزل کی روایت کے عین مطابق ان کی غزل کا موضوع بھی عورت ہے۔ نصرتی نے اپنی غزلوں میں ان تمام عاشقانہ جذبات کا اظہار کیا ہے جو عام طور پر عشق میں پیش آتے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کی اصطلاح میں نصرتی کا تصورِ عشق فاسقانہ ہے۔ نصرتی کی غزل کی ایک خصوصیت جو شاہی کی غزلوں میں کہیں نظر نہیں آتی، جسم کو چھونے اور اس سے ندیدے پن اور عورت کو دیکھ کر رال ٹپکنے کا احساس ہوتا ہے۔ نصرتی کی غزلوں کا تصورِ عشق عورتوں کے جسم سے پیاس بجھانے تک محدود ہے۔[۱۹]

نصرتی کی رباعی کی زبان غزل کی زبان سے زیادہ صاف ہے۔

افسر صدیقی امروہوی نے دیوانِ نصرتی کی تحقیق و تدوین پر چند اعتراضات اٹھائے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس اردو دیوان میں ایک فارسی غزل پیش کی ہے اور اسے نصرتی کی غزل ثابت کرنے کے لیے جو دلائل دیے ہیں ان دلائل کو افسر صدیقی ناکافی گردانتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی نے مقدمے میں نصرتی کے کلام پر اپنی تنقیدی آرا قائم کی ہیں جن میں نصرتی کو تخیل، جذبہ اور معنی آفرینی سے عاری قرار دیا ہے۔ افسر صدیقی امروہوی، ان آرا کو بالکل رد کرتے ہیں۔ دیوانِ نصرتی کے مقدمے میں ان کی شاعری کے مختلف خط و خال اجاگر کر دیے گئے ہیں۔ صنائع بدائع کے مباحث سے اغماض نہیں برتا گیا۔ افسر صدیقی کے نزدیک صنائع بدائع کی امثال سے نصرتی کا دیوان

بھرا پڑا ہے۔ افسر صاحب نے پروف کی غلطیاں بھی گنوائی ہیں۔

— ۵ —

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کدم راؤ پدم راؤ کی تدوین کسی معرکے سے ہرگز کم نہیں ہے۔ یہ وہ بھاری پتھر تھا جسے بہت سوں نے چوما اور چھوڑ دیا۔ مولوی عبدالحق عدم فرصت کی بنا پر یہ معرکہ خود سر کرنے سے محروم رہے۔ انھوں نے کچھ لوگوں کو اس کام پر لگایا، مگر کوئی بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ انھوں نے نصیرالدین ہاشمی کو بھی پاکستان بلانے کی کوشش مگر یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ بالآخر ڈاکٹر جمیل جالبی نے پانچ سال کی شبانہ روز محنت سے یہ معرکہ سر کیا، جسے مولوی عبدالحق اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ اس نسخے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ حیدر آباد (دکن) کے ایک کتب فروش ''لطیف الدین'' کو کدم راؤ پدم راؤ کا ایک قلمی نسخہ ملا، جو انھوں نے نصیرالدین ہاشمی تک پہنچایا اور انھوں نے اس پر مختصر مضمون بہمنی عہد حکومت کا ایک دکنی شاعر لکھا، جو رسالہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ نصیرالدین ہاشمی نے ہی اس کے دو اہم کرداروں کدم راؤ پدم راؤ پر اس مثنوی کا نام رکھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین کے مطابق اس مثنوی کا نام نصیرالدین ہاشمی نے کدم راؤ پدم رکھا تھا۔ کدم راؤ پدم راؤ نام مولوی عبدالحق اور سید ہاشمی فرید آبادی کا طے کردہ ہے۔[۲۰] یہ نسخہ کسی طور مولوی عبدالحق تک پہنچا، وہ خود تدوین کر کے اس مثنوی کو شائع کرنا چاہتے تھے مگر عدیم الفرصتی کی بنا پر وہ ایسا نہ کر پائے، پھر دیگر اہلِ علم کو دعوت دی کہ اس مثنوی کو مرتب کریں۔ مگر کوئی اس مشکل کام پر رضا مند نہ ہوا۔ مثنوی کا رسم الخط نسخ ہونے کے باوجود غیر متعین رسم الخط ہے، جس میں ایک جیسی آوازوں کے لیے حروف کی مختلف شکلیں ہیں۔[۲۱] کاتب غلط نویس ہے، املا درست نہیں، کتابت کے فن میں پختہ مہارت نہیں ہے۔ خط بھی اچھا نہیں ہے۔ ایسے میں اس مخطوطے کو پڑھنا سمجھنا جوے شیر لانے کے مترادف تھا، جسے جمیل جالبی نے تنِ تنہا سر کیا ہے۔ اس کام میں مزید بھی کئی پیچیدگیاں ہیں۔ نسخہ وحید ہے، ناقص الوسط بھی ہے اور ناقص آخر بھی۔ نسخہ وحید ہونے کے سبب اختلافِ نسخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اکثر مصرعے بے وزن ہیں۔ جن کو وزن میں لانے کے لیے مرتب نے کچھ لفظوں یا حرفوں کا اضافہ کیا ہے۔ یہ اضافہ مدور قوسین ( ) کا استعمال کرتے ہوئے عمل میں لایا گیا ہے۔ جہاں کہیں مصرعے میں لفظ یا حروف زائد تھے وہاں ان زائد الفاظ کو چوکور قوسین [ ] میں کر دیا گیا ہے۔ جہاں کاتب سے کوئی لفظ چھوٹا ہے اور مرتب کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا اندراجات تھے، بات مرتب سے بالاتر ہو گئی ہے، اضافہ کرنا یا کوئی قیاسی تصحیح کا عمل ممکن نہیں بن پایا وہاں سوالیہ نشان (؟) لگا دیا گیا ہے۔ جہاں کرم خوردگی یا کسی اور سبب قرأت کا عمل موثر نہیں رہا، وہاں نقطے دے دیے گئے ہیں۔

کدم راؤ پدم راؤ کا نسخۂ وحید، انجمن ترقیٔ اردو کی ملکیت ہے۔ اب تک دنیا میں اس کا کوئی دوسرا نسخہ دریافت نہیں ہوسکا۔ اسے اب تک اردو کی پہلی معلومہ تصنیف کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے مصنف کا نام محققین نے فخر دین نظامی لکھا ہے اور اس مثنوی کا سنِ تصنیف ۱۴۲۱ء اور ۱۴۳۵ء کے درمیان کا زمانہ بتایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تدوین کے بعد یہ سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقیٔ اردو کراچی سے شائع ہوئی اور ۱۹۷۹ء میں اس کا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن نئی دہلی سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ قصے کی خواہ اہمیت نہ ہومگر اس کا متن ادبی مؤرّخوں اور ماہرِلسانیات کے لیے کسی نعمت سے ہرگز کم نہ ہے۔مثنوی کی تدوین جدید اصولوں پر کی گئی ہے۔ ایک صفحے پر مخطوطے کے ایک صفحے کا عکس دیا گیا ہے اور دوسرے صفحے پر اسی متن کو تدوین کے بعد جدید رسم الخط میں پیش کر دیا گیا ہے۔ تاکہ قاری متن کی درست قرات بھی کر سکے اور محققین اصل عکس کے متن اور مدونہ متن کو موازنے و مقابلے سے پرکھ بھی سکیں۔متن کی اپنی اہمیت تو بہر حال ہے ہی مگر مرتب کا مصنّفہ مقدمہ بھی کسی طور پر کم اہم نہیں ہے۔ مقدمے میں اپنے کام کا تعارف، مثنوی کا زمانۂ تصنیف، مقدمے اشعار کی تعداد، مثنوی کا خلاصہ، املا اور کاتب کے بارے میں معلومات، کدم راؤ پدم راؤ کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیے جانے سے متعلق مباحث بھی درج ہیں۔ اس مثنوی کا لسانی مطالعہ اپنی اہمیت کا آپ حامل ہے۔لسانی مطالعے میں پنجابی اثرات، گجراتی اثرات اور سرائیکی و سندھی اثرات کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سابقے لاحقے، افعال وضمائر وغیرہ سے متعلق بھی بحث کی گئی ہے۔ وہ مقدمے میں کدم راؤ پدم راؤ کے نسخے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا دنیا میں ایک ہی معلوم نسخہ ہے، جو انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے۔جس کا سائز ۲ء۷ /انچ ۵ء۱ x /انچ ہے۔ یہ واحد نسخہ بھی ناقص ہے۔ بیچ میں سے اکثر صفحات غائب ہیں اور آخر میں بھی مثنوی کے کم از کم دو تین صفحات کم معلوم ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے کاتب کے نام اور سن کتابت کا بھی پتہ نہیں چلتا۔عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔(۲۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی کو یہ کام ۱۹۶۷ء میں تفویض ہوا۔مخطوطہ اس قدر گنجلک تھا کہ وہ ڈیڑھ سال کی محنت شاقہ کے بعد اس قابل ہوئے کہ اس مسودے کو کچھ نہ کچھ پڑھ سکیں۔ اس عرصے میں وہ حروف اور ان کے جوڑ کی مختلف شکلوں سے جا کے شناسا ہوئے۔ اس نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۳۲ ہے اور ایک شعر آدھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے یکے بعد دیگرے تین نقول تیار کیں۔ ہر دفعہ نظر ثانی کرنے اور آخر میں افسر صدیقی کو دکھانے کے بعد زیورِ طباعت سے آراستہ کرائی گئی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے رائج جدید تحقیق و تدوین کے طریقوں کو مدنظر رکھ کے اپنا کام پایہ تکمیل کو پہنچایا

ہے۔سخت گیر محقق مشفق خواجہ بھی اس کام پر رطب اللسان ہیں:

> جمیل جالبی نے مثنوی کو تدوین کے جدید اصولوں کے مطابق مرتب کیا ہے۔ایک صفحے پر مخطوطے کے ایک صفحے کا ایک عکس چھاپا گیا ہے اور اس کے سامنے کے صفحے پر اسی متن کو جدید رسم الخط میں لکھا ہے۔اس طرح قاری ایک نظر میں اندازہ کر سکتا ہے کہ مرتب نے مثنوی کے متن کو تیار کرنے میں کتنی محنت کی ہے۔اس طریقِ کار سے تحقیق کی مزید راہیں بھی کھلتی ہیں اور اہلِ تحقیق قرأتِ متن کے سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے نتائج کو اصل مخطوطے کے عکسوں کی موجودگی میں بہتر طور پر پرکھ سکتے ہیں۔(۲۳)

مصنف کے نام، زمانے یا مثنوی کے نام سے متعلق جو بھی مباحث ہوں، ڈاکٹر جمیل جالبی بندھے ٹکے مآخذات و منابع سے رجوع کرنا ہی، کافی نہیں سمجھتے بلکہ بالواسطہ ماخذ کو بھی اصلی اور بنیادی ماخذ کی طرح بروے کار لاتے ہیں۔وہ سوانح مرتب کرتے ہوئے سوانحی مآخذ کے علاوہ اس کے کلام میں سے بھی شواہد اکٹھے کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اس دور کی تواریخ، سفرناموں، یاداشتوں، معاصر دواوین اور ذاتی بیاضوں تک کو بروئے کار لاتے ہوئے اہم اور منفرد نتائج اخذ کرتے ہیں۔(۲۴) اس طرح کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف کا نام اور حالاتِ زندگی نامعلوم ہیں۔ان کے نام اور حالات زندگی سے متعلق تذکرے اور تواریخ بھی خاموش ہیں۔صرف واحد ماخذ وہی مثنوی ہے:

> مخطوطے کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف کا نام فخر دین اور تخلص نظامی تھا۔مثنوی میں کئی جگہ اس نے اپنا نام اور تخلص ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے اور االتزام یہ رکھا ہے کہ پہلے ایک شعر میں خود کو اپنے پورے نام فخر دین سے مخاطب کرتا ہے اور ایک یا دو شعر کے بعد وہ اپنا تخلص لاتا ہے۔کئی جگہ اس نے پورا نام فخر دین استعمال کیا ہے۔
>
> سنور فخرؔ دیں اب کسی سَنُور سے
> الو الامر اپنا اسی سَنُور سے
> نظامی جس اوپر پھری ایک چُک
> رتن لال موتی بھرے تِس مُکھ(۲۵)

مقدمے میں مثنوی کے نام اور مصنف کے حالات زندگی کے بعد مثنوی کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔قصہ کوئی خاص نہیں ہے اس مثنوی کے دو اہم کردار کدم راؤ پدم راؤ ہیں۔کدم راؤ راجہ ہے اور پدم راؤ ناگ ہے اور راجہ کا وزیر

ہے۔ مرتب نے اس قصے کی دیگر قصص سے مماثلت کا بھی سراغ لگایا ہے۔ اس مثنوی کی اصل اہمیت زبان اور لسانیات کے نقطۂ نظر سے ہے۔ مثنوی کے مقدمے میں جہاں املا اور اس مثنوی کی زبان اور لسانیات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس قدیم زبان کے دیگر مقامی زبانوں سے مقابلے اور موازنے کے بعد مماثلتیں تلاش کی گئی ہیں، وہ حصہ خاصا اہمیت کا حامل ہے۔ دکن کے یہ متون قدیم ادبی ولسانی نمونے ہیں۔ اس دور کی زبان، املا، صرف ونحو، محاورات، ضرب الامثال، تذکیر و تانیث، روزمرہ، محاورہ اور تلمیحات کا مطالعہ خاصا اہم اور اردو زبان کے قدیم اور تاریخی نمونے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان قدیم متون کے لسانی مطالے خاصے تفصیل سے پیش کیے ہیں تاکہ اس دور کی لسانیات اور لسانی ڈھانچے سے آگہی ممکن ہو سکے۔[۲۶] مثنوی کی املا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا رسم الخط اور املا اصل میں ساری مشکلات کا ذمہ دار ہے دکن میں نسخ کو ایران کی پیروی میں اختیار کیا گیا اور کم وبیش سارے قدیم دکنی مخطوطات اسی رسم الخط میں ہیں۔ لیکن مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا نسخ کچھ اتنا عجیب اور مسخ ہے کہ بس ظاہراً شباہت میں اسے نسخ کہا جا سکتا ہے۔[۲۷]

کاتب بدخط بھی ہے اور اپنے فن پر مہارت اور دسترس نہیں رکھتا۔ ایک ہی حرف کو مختلف طریقوں سے لکھتا ہے۔ اردو کی مخصوص علامتوں کے لکھنے کا کاتب نے کوئی ایک اصول نہیں وضع کیا۔ اردو کی خاص آوازوں کے لیے جو فارسی یا عربی میں مستعمل نہیں ہیں، ان آوازوں کو کہیں من مانی علامتوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ تو کہیں ظاہر ہی نہیں کیا گیا۔ اعراب کو کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ استعمال میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ اس سبب اعراب آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ جزم کے لیے ''ہ'' کی علامت دی گئی ہے۔ یائے معروف ومجہول میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے املا کا اغلاط نامہ مرتب کیا ہے۔ جو ایک صفحے پر مشتمل ہے۔ جس میں ''ہمت'' کو ''حمت''، ''ٹھار'' کو ''تھار'' لکھا گیا ہے۔[۲۸] قصہ یا دیگر شعری فنی لوازمات کے اعتبار سے اس مثنوی میں لاکھ خامیاں ہوں مگر جو اس مثنوی کی لسانی اہمیت ہے اس سے انکار ہرگز ممکن نہیں۔ کدم راؤ پدم راؤ کی لسانی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:۔

> مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی اولین اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو کا قدیم ترین ادبی ولسانی نمونہ ہے۔ ...کھڑی، پنجابی، راجستھانی، برجی، اور گجراتی بولنے والوں کو الگ الگ اس مثنوی کے اشعار پڑھ کر سنائے تو انھوں نے جہاں اور کئی باتیں کہیں وہاں یہ بات مشترک تھی کہ یہ زبان ان کی اپنی زبان سے قریب ہے اور آج بھی اس کے بہت سے الفاظ ان کے گھروں میں بولے جاتے ہیں۔[۲۹]

فاضل مصنف و مرتب نے اس مثنوی کی زبان میں مرہٹی، پنجابی، گجراتی، سرائیکی اور سندھی کے اثرات کا الگ الگ جائزہ لیا ہے۔ پنجابی اثرات کے جائزے میں آنیں، دیسے، کیتا، لوڑے، نیکا، چھوڑسی، نہوسی، کدھیں، رہسی، اگ، دوجا، آکھے، آن، سوں بَہر، آوسی، بدل، نکرسوں، جاسوں، ہارسی، پچھیں، اکھیاں اور ویل۔[۳۰] جیسے الفاظ کا اشتراک دکھایا ہے۔ اسما و افعال کے علاوہ لب و لہجے کا بھی پنجابی سے اشترا کی رشتہ نکالا ہے۔ گجراتی زبان کے اثرات میں افعال وضمائر اور واحد جمع کے طریقوں میں اکثر اشتراک پاتے ہیں۔ ''گجراتی'' اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی زبان میں جے، سہدیس نا، پردیس نا، انے، مانہہ، باپڑا، بیچھو اور پونگڑا۔[۳۱] ایسے الفاظ کا اشتراک تلاش کیا ہے۔ سندھی میں آخری حرف پر عام طور پر ''زبر'' لگایا جاتا ہے اور اس طرح آخری حرف متحرک آواز دیتا ہے۔ اس مثنوی میں بھی یہی قاعدہ عام طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس نشان دہی کے علاوہ سرائیکی، سندھی کے اثرات کی مثالوں میں ''کے'' گھرے، اَچہ، منجھار، رَلی، تلہار، باہ (آگ)، گال، ہیئن، ابھا۔[۳۲] ایسے الفاظ دیے ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی کی زبان میں اسم فاعل، لاحقے، سابقے، نون غنہ کا استعمال جمع کی شکلوں، ضمیر، اسم ضمیر اور حروف کی دیگر شکلوں کے ساتھ ساتھ فعل و متعلقات فعل، مضارع اور امر بنانے کے اصول، افعال کی جمع، مرکب افعال اور ماضی مطلق بنانے کے طریقے اور قاعدے اور خصوصیات کا امثال سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مثنوی میں مقامی زبانوں اور بولیوں کے تو اثرات موجود ہیں مگر عربی اور فارسی کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ زیادہ تر مقامی اثرات ہیں۔ اسلامی تلمیحات بھی ہیں مگر ہندو اساطیر کا رنگ غالب ہے۔ رامائن، ہنومان، رام، ہنونت، ایسی ہندی تلمیحات کا ذکر ملتا ہے۔ مثنوی میں جس طرح محاورہ اور روزمرہ کی رچاوٹ ہے۔ اس بنا پر ڈاکٹر جمیل جالبی اسے اردو زبان کا پہلا نمونہ قرار دینے سے انکاری ہیں۔ اس سے پہلے دکن کی اس زبان میں جو ادب بھی تخلیق پاتا رہا، وہ نامعلوم ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا قیاس آرائی سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

آخر میں ۲۴ رصفحات پر مشتمل لغت، اس زمانے کے معنیاتی نظام کو سمجھنے اور مثنوی کی تفہیم میں نہایت کارگر ہے۔ سب سے آخر میں دو ضمیمہ جات دیے گئے ہیں۔ مثنوی میں مذکور اشخاص کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ضمیمہ نمبر ۱ر میں سلاطین بہمنی اور ضمیمے میں دیگر شخصیات کو شامل کیا گیا ہے۔ انگریزی اردو تمام مآخذات کا اندراج بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا تدوینِ متن کے باب میں منفرد اور اہم کام ہے۔ جو جدید طرز پر پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا ہے۔

جہاں ان کے کام کے بڑے بڑے معترف ہیں وہیں ان کے معترضین کی بھی کمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس کام کے معترف بھی ہیں اور معترض بھی۔ ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ مرتب نے کاتب کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں پہنچائیں اور کدم راؤ پدم راؤ کے اس نسخے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ یہ نسخہ مصنف کا معاصر نسخہ ہے، یا بعد کا، یہ معاملہ لاینحل رہا ہے۔ ان کے نزدیک ''برٹش میوزیم لیبارٹری'' سے اگر استفادہ

کیا جاتا تو یہ معاملہ طے پا سکتا تھا اور نسخے کی قدامت متعین ہو سکتی تھی۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مرتب نے جو اضافے کیے ہیں انھیں قوسین میں نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ متن کی قیاسی تصحیح، حذف و اضافوں پر بھی کئی اعتراض اٹھائے ہیں۔[۳۴]

جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''متن میں یہ علامات استعمال کی گئی ہیں'' کے موضوع کے تحت واضح لکھا ہے جہاں اضافہ کیا ہے اسے گول بریکٹ ( ) اور زائد الفاظ کو چوکور بریکٹ [ ] میں دیا گیا ہے۔ مرتب نے متن میں بھی یہی پابندی بڑی سختی سے کی ہے۔ ہوسکتا ہے قوسین ڈالنے میں مرتب سے کہیں سہو ہو گیا ہو۔ مسعود حسین خان ڈاکٹر جمیل جالبی کے سخت معترض کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کا نام دو اہم کرداروں پر کدم راؤ پدم راؤ رکھا ہے۔[۳۵] جب کہ ''مسعود حسین خان'' کے مطابق نصیر الدین ہاشمی نے مثنوی کا نام کدم راؤ پدم رکھا ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ کا نام مولوی عبدالحق نے دیا ہے۔[۳۶] یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی سے بھول ہوئی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پنجابی، گجروی اور سرائیکی سندھی زبانوں کے اس مثنوی کی زبان پر اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن مسعود حسین خان اس ضمن میں اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پنجابی کے اثرات کا نفوذ کر جانا بھی بعید از قیاس نہیں، البتہ مرتب نے جو وکالت سرائیکی اور سندھی کی کی ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ چند لفظوں یا قواعد کی بعض شکلوں کا اشتراک اس بات کی دلیل نہیں بنتا کہ یہ الفاظ یا قواعدی شکلیں فلاں، فلاں زبان سے لی گئی ہیں۔ محمود شیرانی پنجاب میں اردو لکھتے وقت اسی قسم کے لسانی مغالطے کے شکار ہوئے۔ اب اس کی توسیع سرائیکی اور سندھی تک کر دی گئی ہے۔[۳۷]

مسعود حسین خان پنجابی کا اشتراک تو قبول کرتے ہیں مگر سرائیکی و سندھی پر آ کے انھیں اختلاف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اثرات و اشتراک کی جتنی پنجابی سے امثال دی ہیں تقریباً اتنی ہی گجروی اور سرائیکی و سندھی کی بھی ہیں، مگر مسعود حسین خان کے لیے یہ نا قابل قبول ہے۔ پنجابی کا اشتراک ان کے لیے پھر بھی قابل قبول ہے۔ ان کے کئی اعتراضات قرأتِ متن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثنوی کی دوسری اشاعت ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے، نظر ثانی کے بعد ۱۹۷۹ء کو عمل میں لائی گئی، نئے ایڈیشن میں جالبی صاحب کو حذف و اضافے بھی عمل میں لانے پڑے، انھی کو بنیاد بنا کر مسعود حسین خان نے ۱۸/اشعار کی قرات پر اعتراض اٹھائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

سرا میں تری جب اگنتی ہوئی
ہتیں ساکھ ہو کر نہ آنیں دوئی

پہلے ایڈیشن (۱۹۷۳ء) میں اس کی قرأت یہ تھی:

سوائی تری جب اگنتی ہوئی
ہتیں ساکھ ہو کر نہ آنیں دوئی

حالاں کہ مثنوی کا دوسرا ایڈیشن (۱۹۷۹ء) پہلے کا فوٹوعکس ہے۔ لیکن مرتب نے دعویٰ کیا ہے کہ اس پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ غالباً اس قسم کی لفظی ترمیمات کی جانب اشارہ کیا ہے لیکن ان کے بعد بھی شعر معنی کے اعتبار سے جہاں کا تہاں رہتا ہے۔ خط کشیدہ الفاظ بھی فرہنگ سے غائب ہیں۔[۳۸]

مسعود حسین خان نے مثنوی کے نصف سے زائد اشعار کو ناقابل قرات قرار دیا ہے اور فرہنگ کو بھی نامکمل گردانتے ہیں۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کام کسی کارنامے سے کم نہیں۔ حرفِ آخر تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ان کمیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی قرأت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، فوٹوعکس چھاپ کر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مخطوطے کو عوامی ملکیت بنا دیا ہے، تاکہ اس میں گنجلک متن کی تفہیم و قرات کا سلسلہ آئندہ تک جاری رہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہر نیا محقق، ہر بار متن کی قرات کے دوران نئے گوشوں سے روشناس ہو اور اصل متن کی بازیافت کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اصل اور بنیادی کام سرانجام دے چکے ہیں۔ جو کسی سے بھی نہ ہو پایا۔

— ۲ —

دکنیات میں ان کا ایک اور کارنامہ قدیم اردو لغت ہے، جو انھوں نے تاریخ ادبِ اردو کی ابتدائی جلد کا مواد اکٹھا کرنے کے دوران قدیم دکنی زبان کی لغت مرتب کی ہے۔ اس دوران میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۲۱۳ کے قریب مخطوطات و مطبوعات اور بیاضوں وغیرہ سے استفادہ کیا ہے، جو دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کی تصانیف ہیں۔ اس مطالعے کے دوران وہ مشکل اور غیر مانوس الفاظ کو الگ سے جمع کرتے رہے ہیں، اس طرح گیارہ ہزار سے زائد قدیم الفاظ پر مشتمل قدیم اردو کی لغت مرتب کر ڈالی ہے۔ دکنی زبان و محاورہ آج کی رائج زبان کے اعتبار سے غیر مانوس تھا، اسے سمجھنا انتہائی مشکل کام تھا، اس مشکل کو بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی محنت سے سر کیا ہے۔

> زبان کو سمجھنے کے لیے لغات ہم نے ٹٹولے اور جو لفظ ان میں موجود نہیں تھے انھیں کتابوں کے آخر میں جیسے نیرنگ رئیس تھی ان سے ہم نے مدد لے کر وہ کام کیا اور اس عرصے میں جو مخطوطے ہم نے پڑھے تھے میں نے ان سے کارڈ بنائے تھے اور ان

لفظوں کے معنی لکھے تھے۔ جو متن کو اور اس کے سیاق و سباق کو دیکھ کر تیار ہو سکتے تھے۔ اس طرح سے سوا گیارہ ہزار الفاظ میرے پاس تھے جو میں نے مختلف مخطوطوں سے جمع کیے تھے۔ بعد میں ان کو اکٹھا کر کے اردو کی قدیم لغت کے نام سے چھپوا دیا۔ یہ اس کا By-Product تھا یہ کتاب دو تین بار اردو سائنس بورڈ سے شائع ہو چکی ہے اور لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ By-Product بہت مفید ثابت ہوا۔(۳۹)

قدیم اردو لغت سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں اردو سائنس بورڈ لاہور سے شائع ہوئی، ۲۰۰۸ء تک مذکورہ ادارے سے ہی تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، یہ اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے جس میں بہت قدیم الفاظ شامل ہیں۔ جو عام لغات میں نظر نہیں آتے۔ یہ لغت ماہرینِ لسانیات، ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ ادب کے اساتذہ کے لیے یکساں مفید اور کارگر ہے۔ ماہرینِ لسانیات جو خاص طور پر مقامی زبانوں اور بولیوں کے مقابلے و موازنے اور باہمی اثرات کے جائزے سے دل چسپی رکھتے ہیں، ان کے لیے اردو کی قدیم املا، تلفظ، زبان کے اصول و قواعد اور زبانوں کے باہمی تعلق اور رشتوں کے مطالعات خاصے اہمیت کے حامل ہیں اور تحقیق کی نئی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ لغت کو مرتب کرنے کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تمام ممکنہ قدیم مطبوعہ و غیر مطبوعہ مآخذات، نسخوں، مخطوطوں اور بیاضوں سے استفادہ کیا ہے۔ قدیم اردو لغت مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، میں استعمال ہونے والے الفاظ اس کے علاوہ گجری اردو، عادل شاہی اور قطب شاہی کے دور کی تصانیفِ نظم و نثر کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لغت میں املا، الفاظ و مرکبات و مشتقات اور مصادر وغیرہ کی پیش کش کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس لغت کو مرتب کرتے وقت میں نے حسب ضرورت مصدر، حاصل مصدر، امر، ماضی مطلق، مرکبات و مشتقات کی بیشتر شکلیں شامل کر دی ہیں تا کہ قدیم ادب کا مطالعہ کرنے والے کو مصدر کی بدلی ہوئی شکل پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ ساتھ ساتھ اگر ایک ہی لفظ مختلف املائی شکلوں میں ملا تو اس کی یہ شکلیں بھی شامل کر دی ہیں تا کہ پڑھنے والے کو کسی غلط فہمی یا الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔ اس کے علاوہ اگر مختلف مآخذ سے ایک ہی لفظ کے مختلف معانی سامنے آئے ہیں تو ان سب معانی کو اسی لفظ کے تحت یکجا کر دیا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس لغت میں الفاظ کے وہی معنی دیے گئے ہیں جو قدیم دور میں رائج تھے۔(۴۰)

مشفق خواجہ قدیم اردو کی لغت کے معترف بھی ہیں اور معترض بھی:

ممکن ہے اس لغت میں بعض ایسی باتیں نظر آئیں جو لغت نگاری کی عام روایت کے خلاف نظر آئیں مثلاً کہیں واحد کو لغت بنایا گیا ہے اور کہیں جمع کو، اور کہیں دونوں ہی کو الگ الگ لغت مان کر معنی لکھ دیے گئے ہیں۔ الفاظ کی مختلف املائی صورتوں کا اندراج بھی الگ الگ ہوا ہے۔ مثلاً ایڑنا بھی ہے اور اپڑنا، بھی۔ لیکن دونوں جگہ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس لفظ کی دوسری املائی صورت بھی ہے، جسے لغت میں شامل کیا گیا ہے۔ ایسے الفاظ کے ساتھ باہم دیگر حوالے دینے ضروری تھے۔ بعض جگہ الفاظ کے اندراج میں اندرونی الف بائی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔[۴۱]

یہ سب باتیں اس لغت کی اہمیت کو کم نہیں کرتیں۔ اس لغت کی افادیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

—۷—

تاریخ ادبِ اردو (جلد اول) قدیم دور کا احاطہ کرتی ہے، ڈاکٹر جمیل جالبی نے آغاز سے ۱۷۵۰ء تک کے دور کا احاطہ کیا ہے۔ یہ جلد دکنی دور کی تحقیق و تاریخ کا عالی نمونہ ہے۔ اسے جولائی ۱۹۷۵ء میں مجلسِ ترقیٔ اردو لاہور نے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ تاریخ ادبِ اردو کا یہ کام سب سے اہم معتبر، تفصیلی اور سب سے غیر جانب دار مانا جاتا ہے۔ لسانی بصیرت، تنقیدی، تحقیقی، تذکراتی، اور تاریخی ترسیلیت اور نقطۂ نظر کی میکانکیت انھیں دیگر مؤرّخوں سے جدا کرتی ہے۔ ان کا لسانی شعور، تحقیقی بصیرت، تاریخ جغرافیہ اور سماجی علوم پر دسترس، انھیں اپنے کام میں معتبر حوالہ بنا دیتے ہیں۔[۴۲] ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی مساعی جمیلہ سے وہ کام کر دکھایا ہے۔ جو بڑے بڑے ادارے بھی نہیں کر پائے۔ ان کا یہ کام چار جلدوں پر محیط ہے۔[۴۳] ہمارے مدنظر پہلی جلد ہے جو دکنی دور کا احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو سے پہلے جو ادبی تاریخ کے نمونے ملتے ہیں وہ علاقوں یا ادوار کے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کام اس سے مختلف ہے۔ وہ زبان کی ابتدائی تشکیلات کا سراغ لگاتے ہیں اور اس کے بعد ادبی روایات کی مختلف کڑیوں کو ملانے کے بعد اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اردو ادب مختلف ٹکڑوں اور خطوں میں بٹا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس طرح انھوں نے ادب کی ایک مربوط تاریخ مرتب کرنے کی بنیاد ڈالی ہے:

اب تک جتنی ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں مختلف علاقوں کا قدیم اردو ادب الگ الگ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا یہ سب الگ الگ جزیرے ہیں جن کے ادب وزبان کے مطالعے کا مجموعی نام تاریخ ادب رکھ دیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ بات

> قابلِ قبول نہیں تھی کہ گجرات دکن اور شمال کا ادب الگ الگ جزیروں کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک کا تعلق دوسرے سے کچھ نہیں ہے۔ جب میں نے قدیم ادب کا براہِ راست مطالعہ کیا تو اثرات و روایات کا ایک ایسا سلسلہ نظر آیا جو ایک دوسرے سے پوری طرح پیوست تھا۔ یہ تحقیق کی ایک نئی صورت تھی۔ اس انداز نظر سے اس تصنیف کو وہ صورت عطا کی، جو آپ کے سامنے ہے۔ اس میں مطالعہ، تحقیق، فکر اور طرز ادا سب مل کر ایک ہو گئے ہیں۔(۴۴)

پہلی جلد کی تمہید میں ''اردو زبان اور اس کے پھیلنے کے اسباب'' اختصار سے بیان کیے گئے ہیں۔ فصل اول جو شمالی ہند (۱۰۵۰ء۔۱۷۰۷ء) کا احاطہ کرتی ہے، اس میں باب اول میں مسعود سعد سلمان سے گرونانک تک (۱۰۵۰ء۔۱۵۲۵ء) کے دور میں اردو زبان کے ابتدائی ادبی نمونوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ دوسرا باب بابر سے شاہ جہاں تک (۱۵۲۵ء۔ ۱۶۵۷ء) کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ سیاسی و سماجی حالات جو زبان و ادب کی بنیاد اور ترقی کے لیے کارگر ثابت ہوئے ان کو صراحت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ اردو زبان کی ترقی مسلمانوں سے جوڑتے ہیں۔ جس میں صوفیۂ کرام کا اہم کردار ہے۔ تیسرا باب دور اورنگ زیب (۱۶۴۷ء۔۱۷۷۷ء) کا احاطہ کرتا ہے۔ فصل دوم گجری ادب اور اس کی روایت (۱۰۵۰ء۔۱۷۰۷ء) کے مکمل تاریخی و تہذیبی اور لسانی و ادبی جائزے پر مشتمل ہے۔ پہلا باب پانچویں صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک (۱۰۵۰ء۔۱۴۰۰ء) کی زبان و ادب کا جائزہ پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات، لغات، کتبے، (۱۴۰۰ء۔۱۶۰۰ء) وغیرہ کے مطالعات پر مبنی ہے۔ نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت، (۱۴۰۰ء۔۱۶۰۰ء) تک کے جائزے کے لیے اس فصل کا تیسرا باب مختص کیا گیا ہے۔ اس دور کی شاعری پر ہندی روایت اور اسطور کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ چوتھا باب گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری میں گجری اردو روایت (۱۶۰۰ء۔۱۷۰۷ء) کو موضوع بناتا ہے۔ اس دور کی زبان منجھی ہوئی اور صاف ہے۔

اردو بہمنی دور میں (۱۳۵۰ء۔۱۵۲۵ء) جس قدر پھلی پھولی اور اس کا ادب وجود میں آیا ہے وہ دیگر ادوار سے زیادہ ہے۔ اس کا جائزہ لینے کے لیے فصلِ سوم مختص کی گئی ہے۔ اس دور تک زبان کا خمیر پوری طرح تیار ہے اور وہ اس قابل بھی ہے کہ اسے ادب کی تخلیق کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس فصل کے بابِ اول میں اس زمانے کے سیاسی سماجی پس منظر، ماخذ اور خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب ادب کی روایت کو نویں اور دسویں ہجری کے اوائل میں (۱۴۳۰ء۔۱۵۲۵ء) نظامی سے اشرف تک لے جاتا ہے۔ فخر الدین نظامی،

میراں جی شمس العشاق اور اشرف کی مثنویات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دکنی ادب کی روایت میں عادل شاہی دور خاصا زرخیز ہے۔ عادل شاہی دور (۱۴۹۰ء۔۱۶۸۵ء) کو فصلِ چہارم میں جگہ دی گئی ہے۔ اس فصل کا پہلا باب اس دور کے پس منظر روایت اور ادبی و لسانی خصوصیات (۱۹۹۰ء۔۱۶۸۵ء) کا احاطہ کرتا ہے۔ اس دور کا دکنی ادب گجری و ہندی روایت کی توسیع ہے۔ یہ زمانہ گجری روایت کی توسیع کے ساتھ ساتھ ہندی روایت کے عروج کا زمانہ بھی ہے جو ۱۵۲۵ء سے ۱۶۲۷ء پر مشتمل ہے۔ اس کے لیے دوسرا باب مختص کر دیا گیا ہے۔ تیسرا باب اسی دور میں ہندی اور فارسی روایت کی کشمکش (۱۶۲۷ء۔۱۶۴۰ء) کے عنوان کے تحت باندھا گیا ہے۔ ہندوی روایت کا اثر اردو پر ماند پڑتا اور فارسی کا اثر گہرا ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ فارسی روایت کے بڑھتے رواج اور چلن کے جائزے کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے چوتھے باب میں پیش کیا ہے یہ ۱۶۴۰ء سے ۱۶۵۷ء تک کا زمانہ ہے۔ اس دور میں ملک خوشنود، رستمی اور صنعتی ایسے شعرا نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سولھویں صدی کے زمانے کے ایک غزل گو شاعر حسن شوقی کی غزلیات دریافت کر کے اردو غزل کو ولی سے کافی پیچھے لے گئے ہیں۔ پانچویں باب میں حسن شوقی کو پیش کیا گیا ہے۔ چھٹا باب مذہبی تصانیف پر فارسی اثرات (۱۶۴۰ء۔۱۶۷۵ء) کے جائزے پر مبنی ہے۔ شیخ محمد اول اور امین الدین اعلیٰ کی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۶۵۷ء سے ۱۶۷۵ء تک کے دور کو ''دکنی ادب کا عروج'' قرار دیتے ہیں۔ اس فصل کے ساتویں باب میں دکنی ادب کو عروج تک پہنچانے والے شعرا حسن شوقی، ملا نصرتی کو شامل کیا گیا ہے۔ ۱۶۵۷ء سے ۱۶۸۵ء تک کا دور جو اس فصل کے آٹھویں باب میں موجود ہے۔ کو نیا عبوری دور قرار دیتے ہیں۔ جس میں سید میراں میاں خاں ہاشمی کو جگہ دی گئی ہے۔ اس دور کے آخر تک قدیم اردو کا رنگ پھیکا پڑتا جاتا ہے اور پورے ہندوستان میں ادبی اظہار یکساں نظر آتا ہے۔

فصلِ پنجم قطب شاہی دور (۱۵۱۸ء۔۱۶۸۶ء) کا احاطہ کرتی ہے۔ باب اول اس دور کے پس منظر، روایت اور ادبی و لسانی خصوصیات پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب فارسی روایت کے آغاز (۱۵۱۸ء۔۱۵۸۰ء) کو موضوع بناتا ہے۔ آغاز میں فیروز بیدری، محمود اور ملا خیالی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے، ان کی شاعری سے فارسی اسلوب کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے۔

تیسرا باب، فارسی روایت کے رواج اور عروج (۱۵۸۰ء۔۱۶۱۰ء) کا احاطہ کرتا ہے۔ جس میں محمد قلی قطب شاہ کے دور اور ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ شیخ احمد گجراتی کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھا باب فارسی روایت کے عروج اور اس دور کی نظم و نثر (۱۵۸۰ء۔۱۶۴۰ء) کا احاطہ کرتا ہے۔ جس میں ملا وجہی کی قطب مشتری اور نثری تصنیف سب رس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں باب فارسی روایت کی توسیع (۱۶۲۵ء۔۱۶۷۲ء) پر مبنی

ہے۔اس دور میں عبداللہ قطب شاہ کے زمانے اور ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ غواصی قطب رازی، ابن نشاطی، جنیدی، سید بلاقی، عبداللطیف، معظم کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس دور کے نثر نگاروں میں ملا وجہی، میراں جی، حسین خدا نما اور میراں یعقوب، کو شامل کیا گیا ہے۔ (۱۶۷۲ء۔۱۶۸۶ء) کے دور کو ''فارسی روایت کی تکرار'' کا زمانہ قرار دیتے ہوئے چھٹے باب میں جگہ دی گئی ہے۔ساتواں باب دکنی روایت کے اختتام کو موضوع بناتا ہے۔آخر دکنی دور کے شعرا میں حسین ذوقی، قاضی محمود بحری محمد باقر آگاہ وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔فصلِ ششم فارسی روایت کا نیا عروج ریختہ (۱۶۸۵ء۔۱۷۵۰ء) کے دور کو موضوع بناتا ہے۔ باب اول میں ''ولی دکنی'' اور ان کے زیر اثر پنپنے والی نئی فارسی روایت جسے ریختہ کا نام دیا گیا ہے، کا احاطہ کرتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادبِ اردو (جلد اول) کے خاکے سے متعلق لکھتے ہیں:

> اس جلد کا خاکہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ ساری تصنیف کو ترتیب زمانی سے چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر فصل کے تحت مختلف ابواب آتے ہیں۔ ہر فصل کا پہلا باب پورے دور کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔جس میں اس دور کی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی و لسانی خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔تاکہ پڑھنے والے کے سامنے اس دور کی واضح تصویر آجائے۔اس تمہیدی باب کی روشنی میں، ترتیب زمانی سے، اس دور کے ممتاز و نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے ذہن و اثرات اور ان کی تخلیقی کاوشوں کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ چوں کہ ہر دور کی نظم و نثر ایک ہی طرز احساس کا اظہار کرتی ہے اس لیے دوسری تاریخوں کے برخلاف، ان کا مطالعہ بھی ایک ساتھ ہی کیا گیا ہے۔ ہر شاعر و ادیب کو اس کی تاریخی و ادبی حیثیت کے مطابق صفحات دیے گئے ہیں۔قدیم دور کے ادب کا مطالعہ اس لیے اور بھی دشوار تھا کہ اس دور کا بیشتر سرمایہ مخطوطات پر مشتمل ہے۔جن کے حوالے حواشی میں دیے گئے ہیں۔ یہی عمل مطبوعہ کتب کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اختتامیہ میں اختصار کے ساتھ روایت کے اتار چڑھاؤ کی داستان کو بیان کر دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ اردو زبان کے عالم گیر رواج کے منطقی وجوہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔آخر میں ضمیمے کے تحت پاکستان میں اردو کو موضوع بنا کر پاکستان کے چاروں صوبوں میں اردو کے گہرے تعلق اور قدیم روایت کا سراغ لگایا گیا ہے۔ لکھتے وقت میں نے ''اسلوب و بیان'' کو خاص اہمیت دی ہے۔دوران مطالعہ آپ محسوس کریں گے کہ میں نے ایک ایسا اسلوب

دریافت کیا ہے جو ادب کی فکری تنقیدی وتہذیبی تاریخ کے لیے شاید موزوں ہے۔[۴۵]

تاریخ ادبِ اردو میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نقل در نقل سے گریز کیا ہے۔ اس لیے وہ نئے نسخوں اور تحریروں کا سراغ لگا پائے ہیں۔ ان کا تحقیقی معیار خاصا بلند ہے اور تنقیدی آرا افراط وتفریط سے پاک ہیں۔ وہ ذاتی پسند اور ناپسند کو بالائے طاق رکھ کر تنقیدی محاکے پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مواد کی فراہمی کے لیے بہت عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ مطبوعات کے علاوہ مخطوطات، بیاضوں، ادبی وغیر ادبی ہر طرح کے مآخذات کو بروئے کار لا کر نئے اور دلچسپ نتائج سامنے لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مشفق خواجہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> جمیل جالبی نے مواد کی فراہمی کے لیے بڑی کھکھیڑ اٹھائی ہے۔ انھوں نے کرم خوردہ، دریدہ، آب رسیدہ اور بڑی حد تک ناخوانا مخطوطات سے جس طرح استفادہ کیا ہے وہ انھیں کا کام تھا۔ اگر وہ صرف مطبوعہ ادبی ذخیرے سے استفادہ کرتے تو یہ تاریخِ ادب اپنی بہت سی خوبیوں سے محروم ہو جاتی۔ مخطوطات سے استفادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جالبی نے شاعروں ادیبوں سے براہِ راست تعلق پیدا کیا ہے وہ کسی مرتب یا محقق کے توسط سے مواد فراہم نہیں کرتے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ جالبی کی تحریر میں وہ اعتماد پیدا ہو گیا ہے جس کے بغیر ادبی مؤرّخ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔[۴۶]

رشید حسن خان تاریخ ادبِ اردو پر معترض ہیں کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ثانوی یا اس سے بھی کم تر حوالوں پر استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔ کئی مقامات پر حوالے بھی درج نہیں کیے۔ قابلِ قبول اور ناقابل قبول ہر طرح کے مآخذات کو یکساں برتا گیا ہے۔ سنین کے حوالے درج نہیں ہیں۔ کتاب کے ایڈیشنوں کا ذکر نہیں ہے۔ جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ غیر معتبر راویوں کی روایتوں کو جانچے پرکھے بغیر ہی قبول کر لیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نظم ونثر کے نمونے جو پیش کیے گئے ہیں قابل اعتماد ہیں یا نہیں۔ آخر میں پیش کردہ پانچ ضمیمہ جات جو پاکستان میں اردو کے عنوان کے تحت ہیں۔ ان ضمیموں کو تاریخ ادبِ اردو کے تاریخی ربط تسلسل کے لیے مضر قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مصنف نے پہلے تو کتاب کو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے سے بچایا، آخر میں خود ہی اسی تسلسل کو انتشار کے حوالے کر دیا ہے۔ زبان کی بحث جو جمیل جالبی کی ہے، اسے غلط مبحث قرار دیتے ہیں۔ جو قیاسات کا مجموعہ ہے۔[۴۷]

ان اعتراضات کا مدلل جواب گیان چند جین نے دیا ہے۔ تاریخ ادب اور اس کے پرکھنے کے مذکورہ بالا اصولوں کو رد کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک ایسے کڑے اصولوں پر پرکھا جانے لگے تو بہت سی چیزیں القط ہوتی ہیں۔ اردو میں بہت سے مخطوطے ایسے ہیں جن کے مصنف، مرتب، کاتب اور سنہ تصنیف یا سنہ کتابت کا علم نہیں ہے، ان کو اگر غیر معتبر

کہہ کر رد کر دیا جائے تو اردو ادب کی تاریخ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ثانوی ماخذات والے اعتراض کو بھی رد کرتے ہیں کہ جالبی نے کئی مخطوطات اور بیاضوں کو خود سے دیکھا اور مرتب کر کے چھپوایا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین جمیل جالبی کی بیک وقت تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں پر ان کے معترف ہیں اور ان کی تاریخ ادبِ اردو میں یہ دونوں پہلو در آئے ہیں۔ جالبی کے ہاں مختلف ادوار اور علاقوں کی ادبی روایات کو ان کے سماجی و فکری منظر میں جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کے وہ خاص معترف ہیں۔[۴۸] مزید لکھتے ہیں:

> کتاب میں خوبیوں کے مقابلے میں خامیاں بہت کم ہیں۔ یاد رہے کہ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ جو شخص اتنے بڑے دور اور بڑے علاقے کے اتنے وسیع موضوع پر قلم اٹھائے گا اس سے کہیں نہ کہیں بلکہ کئی جگہ، تسامح تو ہو گا ہی۔ کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ ادبِ اردو اب تک کی بہترین تاریخ ہے۔ کوئی توقع نہیں کہ عرصے تک اس سے بہتر بلکہ اس کی ہم پلّہ تاریخ لکھی جا سکے گی۔[۴۹]

تاریخ ادبِ اردو کے اس کام کا انھوں نے آغاز ہی میں چار جلدوں میں سمونے کے لیے خاکہ مرتب کیا تھا، اسے بخوبی پورا کرنے کے بعد اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کی تاریخ ادبِ اردو کی دوسری جلد جو اٹھارھویں صدی کا احاطہ کرتی ہے جون ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ تیسری جلد جو انیسویں صدی کے نصف تک تخلیق پانے والے ادب کی تاریخ پر مشتمل ہے جو جون ۲۰۰۶ء کو شائع ہوئی ہے چوتھی اور آخری جلد فروری ۲۰۱۲ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی اس دنیا میں تاریخ ادبِ اردو لکھنے کے لیے بھیجے گئے تھے، جسے مکمل کرنے کے کچھ عرصہ بعد اٹھا لیے گئے۔ ان کا یہ کام، جب تک اردو قائم و دائم ہے یاد رکھا جائے گا۔ ہمیشہ انھوں نے ایسے کاموں کی ٹھانی، جو کوئی بھی نہ کر سکا۔ انھوں نے اداروں کا کام تن تنہا کر دکھایا۔

—۸—

ڈاکٹر جمیل جالبی کئی اعتبار سے منفرد محقق ہیں۔ ان کی تحقیق، تحقیق و تنقید کا امتزاج ہے۔ ان کا اسلوب اس قدر شگفتہ ہے کہ قاری کی دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر جمیل جالبی کے انداز تحقیق کی ایک نمایاں خوبی جو انھیں اردو کے دوسرے محققین سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے انداز تحریر کی شگفتگی اور ادبی پن ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں تحقیقی اور تنقیدی اسالیب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش

کی ہے جس سے نثر میں ایک تخلیقی مزاج پیدا ہو گیا ہے۔ اس تخلیقی رویے نے ان کی تحریروں میں ایسی رونق اور زیبائی پیدا کر دی ہے۔ بظاہر خشک سے خشک موضوع ان کے ہاں پر کیف نظر آتا ہے۔ جالبی صاحب نے تحقیق اور تنقید میں اتصال اور ہم آہنگی کو اس طرح فروغ دیا ہے کہ ان کے ہاں تنقیدی فکر سے تحقیق کی صورت گری ہوئی ہے اور تحقیق کے ذریعے تنقید کو درجۂ استناد ملا ہے۔(۵۰)

دکنیات کے حوالے سے تحقیق کا کام کافی ہوا ہے جس میں کئی کمیاں کوتاہیاں موجود ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے قدیم دکنی مخطوطات کی تدوین، قدیم اردو کی لغت اور دکنی ادب کی مربوط و مبسوط تاریخ (تاریخ ادبِ اردو، جلداوّل) کی ترتیب، اپنی بے پناہ محنت، لگن، عمیق مطالعہ اور منطقی فکر سے انجام دی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بلاشبہ دکنیات کے ایک معتبر حوالے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

## حواشی

۱۔ محمد خان اشرف، اشرف اللغات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۹۰۔

۲۔ گوہر نوشاہی، اردو تحقیق پر ایک مصاحبہ، مشمولہ جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ محمد خاور جمیل اور مصطفیٰ کمال پاشا (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس، ۲۰۱۵ء)، ص ۵۳۶۔

۳۔ تبسم کاشمیری، جمیل جالبی سے ایک مکالمہ، مشمولہ اردو کے نامور محققین، مرتبہ تبسم کاشمیری اور محمد ذیشان وکیل (لاہور: پاکستان رائٹرز کوا پریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۸ء)، ص ۸۸۷۔

۴۔ عظمت رباب، اردو تدوینِ متن کی روایت (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۳۹۹۔

۵۔ گوہر نوشاہی، محولہ بالا، ص ۵۴۲۔

۶۔ وحید قریشی، دیوان حسن شوقی، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، مرتبہ، محمد خاور جمیل (کراچی، ایسٹ پبلشرز، ۲۰۱۶ء)، ص ۵۲۷۔

۷۔ گوہر نوشاہی، محولہ بالا، ص ۵۴۲

۸۔ جمیل جالبی، دیوان حسن شوقی (کراچی: انجمن ترقیٔ اردو، پاکستان، ۱۹۷۱ء)، ص ۶۴۔

۹۔ افسر صدیقی امروہوی، دیوان حسن شوقی، مشمولہ جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ، خاور جمیل اور مصطفیٰ کمال پاشا (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء)، ص ۴۱۶۔

۱۰۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر جمیل جالبی کا انداز تحقیق، مشمولہ، جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ، محمد خاور جمیل اور مصطفیٰ کمال پاشا (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء)، ص ۵۷۰

۱۱۔ جمیل جالبی، محولہ بالا، ص ۲۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۲۔۵۴

۱۳۔ ایضاً،ص ۵۲
۱۴۔ ایضاً،ص ۴۹
۱۵۔ ایضاً،ص ۶۵
۱۶۔ وحید قریشی،محولا بالا،ص ۲۴۔۵۲۲
۱۷۔ جمیل جالبی، دیوان نصرتی (لاہور: قوسین، ۱۹۷۲ء)،ص ۲
۱۸۔ عبدالعزیز ساحر، تحقیق و تدوین کے رنگ،مشمولہ اردو ادب کے نامور محققین،مرتبہ تبسم کاشمیری اور محمد ذیشان وکیل (لاہور پاکستان رائٹرز کوا پریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۸ء)،ص ۸۸۸۔
۱۹۔ جمیل جالبی،محولہ بالا، ۲۰۱۷ء،ص ۱۴
۲۰۔ مسعود حسین خان، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مرتبہ، جمیل جالبی پر ایک نظر،مشمولہ اردو کے نامور محققین، مرتبہ تبسم کاشمیری اور محمد ذیشان وکیل (لاہور: پاکستان رائٹرز کوپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۸ء)،ص ۸۱۲۔
۲۱۔ مشفق خواجہ، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ،مشمولہ جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ محمد خاور جمیل اور مصطفیٰ کمال پاشا (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء)،ص ۵۱۵۔
۲۲۔ جمیل جالبی، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۹ء)،ص ۱۰۔
۲۳۔ مشفق خواجہ،محولہ بالا،ص ۵۱۷
۲۴۔ گوہر نوشاہی،محولہ بالا،ص ۵۰۷
۲۵۔ جمیل جالبی،محولہ بالا،ص ۱۷
۲۶۔ عظمت رباب، اردو تدوین متن کے علمبردار، تحقیقی اور تنقیدی مطالعات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۷۰
۲۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،محولہ بالا،ص ۲۷
۲۸۔ ایضاً،ص ۲۸
۲۹۔ ایضاً،ص ۲۵۔۳۶
۳۰۔ ایضاً،ص ۴۴۔۴۵
۳۱۔ ایضاً،ص ۴۵۔۴۶۲
۳۲۔ ایضاً،ص ۴۶
۳۳۔ ایضاً،ص ۴۳
۳۴۔ وحید قریشی،مثنوی کدم راؤ پدم راؤ،مشمولہ،ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، (کراچی: ایلیٹ پبلشرز، ۲۰۱۶ء،)ص ۵۱۹۔ ۵۲۳۔
۳۵۔ جمیل جالبی،محولہ بالا،ص ۱۶
۳۶۔ مسعود حسین خان،محولہ بالا، ۲۰،ص ۸۱۴
۳۷۔ ایضاً،ص ۸۱۷
۳۸۔ ایضاً،ص ۸۱۹

۳۹۔ تبسم کاشمیری، محولہ بالا، ص ۸۱۴
۴۰۔ جمیل جالبی، قدیم اردو لغت (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۸ء)، ص ۴
۴۱۔ مشفق خواجہ، قدیم اردو لغت، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، مرتبہ، محمد خاور جمیل (کراچی: ایلٹ پبلشرز، ۲۰۱۶ء)، ص ۶۸۸۔
۴۲۔ مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'': ایک سنگ میل، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، مرتبہ، محمد خاور جمیل (کراچی: ایلٹ پبلشرز ۲۰۱۶ء)، ص ۶۴۲
۴۳۔ آج بتاریخ ۱۸/اپریل جمعرات بوقت گیارہ بج کر انچاس منٹ، صبح، کراچی سے انجمن ترقیٔ اردو کے ایک محترم دوست کا پیغام موصول ہوا کہ آج جالبی صاحب ہم میں نہیں رہے۔
۴۴۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، اگست، ۲۰۰۷ء)، پیش لفظ: ص ز، ح۔
۴۵۔ ایضاً، پیش لفظ: ص ح، ط۔
۴۶۔ مشفق خواجہ، اردو ادب کی پہلی تاریخ، مشمولہ ادبی تاریخ نویسی، مرتبہ، ڈاکٹر سید عامر سہیل اور نسیم عباس احمر (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۵ء)، ص ۴۶۱۔
۴۷۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ (لاہور: الفیصل ناشران، جولائی، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۹۱۔۲۹۴۔
۴۸۔ گیان چند جین، اردو کی ادبی تاریخیں (کراچی: انجمن ترقیٔ اردو، ۲۰۱۵ء)، ص ۶۸۸۔۶۹۱۔
۴۹۔ ایضاً، ص ۷۲۸۔۷۲۹۔
۵۰۔ گوہر نوشاہی، محولہ بالا، ص ۵۱۳۔

## مآخذ


۱۔ اشرف، محمد خان، اشرف اللغات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔
۲۔ امروہوی، افسر صدیقی، دیوان حسن شوقی، مشمولہ جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ، خاور جمیل اور مصطفیٰ کمال پاشا، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء۔
۳۔ جالبی، جمیل، دیوان حسن شوقی، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو، پاکستان، ۱۹۷۱ء۔
۴۔ _____، دیوان نصرتی، لاہور: قوسین ۱۹۷۲ء۔
۵۔ _____، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۹ء، اشاعت دوم۔
۶۔ _____، قدیم اردو لغت، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۸ء، اشاعت دوم۔
۷۔ _____، تاریخ ادب اردو، جلد اول، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، اگست، ۲۰۰۷ء۔
۸۔ جین، گیان چند، اردو کی ادبی تاریخیں، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو، ۲۰۱۵ء۔
۹۔ خان، رشید حسن، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، لاہور: الفیصل ناشران، جولائی، ۲۰۱۶ء۔
۱۰۔ خان، مسعود حسین، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مرتبہ، جمیل جالبی پر ایک نظر، مشمولہ اردو کے نامور محققین، مرتبہ تبسم کاشمیری اور محمد ذیشان وکیل، لاہور: پاکستان رائٹرز کوپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۸ء۔

۱۱۔ خواجہ، مشفق، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مشمولہ جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ محمد خاور جمیل اور مصطفیٰ کمال پاشا، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء۔
۱۲۔ _____، قدیم اردو لغت، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، مرتبہ، محمد خاور جمیل، کراچی: ایلیٹ پبلشرز، ۲۰۱۶ء۔
۱۳۔ _____، اردو ادب کی پہلی تاریخ، مشمولہ ادبی تاریخ نویسی، مرتبہ، ڈاکٹر سید عامر سہیل اور نسیم عباس احمر، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۵ء، ص ۴۶۱۔
۱۴۔ رباب، عظمت، اردو تدوین متن کی روایت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء۔
۱۵۔ _____، اردو تدوین متن کے علمبردار، تحقیقی اور تنقیدی مطالعات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء۔
۱۶۔ ساحر، عبدالعزیز، تحقیق و تدوین کے رنگ، مشمولہ اردو ادب کے نامور محققین، مرتبہ تبسم کاشمیری اور محمد ذیشان وکیل، لاہور پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۸ء۔
۱۷۔ قریشی، وحید، دیوان حسن شوقی، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، مرتبہ، محمد خاور جمیل، کراچی، ایسٹ پبلشرز، ۲۰۱۶ء۔
۱۸۔ _____، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مشمولہ، ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، کراچی: ایلیٹ پبلشرز، ۲۰۱۶ء۔
۱۹۔ کاشمیری، تبسم، جمیل جالبی سے ایک مکالمہ، مشمولہ اردو کے نامور محققین، مرتبہ تبسم کاشمیری اور محمد ذیشان وکیل، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۸ء۔
۲۰۔ نوشاہی، گوہر، اردو تحقیق پر ایک مصاحبہ، مشمولہ جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ محمد خاور جمیل اور مصطفیٰ کمال پاشا، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ، ہاؤس، ۲۰۱۵ء۔
۲۱۔ _____، ڈاکٹر جمیل جالبی کا انداز تحقیق، مشمولہ، جمیل جالبی یا اردو ادب کی تاریخ، مرتبہ، محمد خاور جمیل اور مصطفیٰ کمال پاشا، نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء۔
۲۲۔ ہرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'': ایک سنگ میل، مشمولہ ڈاکٹر جمیل جالبی، بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، مرتبہ، محمد خاور جمیل، کراچی: ایلیٹ پبلشرز ۲۰۱۶ء۔